© rasailojaraid.com

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

نعیم صدیقی

(۳)

تبیینِ کتاب کے چار شعبے نبی صلعم کا منصب یہ بتایا گیا ہے — اور متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے۔ کہ:-

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (جمعہ: ۱) وہ (یعنی نبی صلعم) ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

کوئی معقول آدمی اس آیت پر نظر ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں نبی صلعم کا ایک ہی فرض الفاظ بدل بدل کر اور مترادفات کو استعمال کر کے سامنے لایا گیا ہے، بلکہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ تلاوتِ آیات اور تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت، فرائض نبوت کے ایسے شعبے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اب آئیے، ان میں سے ہر شعبے پر کسی قدر تفصیل سے نگاہ ڈالیں۔

اس آیت نے فرائض نبوت چار بیان کیے ہیں، ان کو ہم سہولتِ توضیح کے لیے ایک بدلی ہوئی ترتیب کے ساتھ (جو دعائے ابراہیم میں پائی جاتی ہے۔ بقرہ - ۱۵) سامنے رکھتے ہیں:-

(۱) تلاوتِ آیات (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیہ

تلاوتِ آیات نبی صلعم کا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت فرمائیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آیاتِ قرآنی آپؐ پر نازل کی ہیں، اور جب جب کی ہیں، اور جس ترتیب سے کی ہیں، ان کو جوں کا توں بندگانِ خدا تک پہنچا دیں۔ آیات کو جوں کا توں پہنچانے کی ذمہ داری جو نبی صلعم پر عائد کی گئی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ ذیل کی آیت سے ہو سکتا ہے:-

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ اور اگر (نبی صلعم) گھڑ لاتا اپنی طرف سے ہم پر کوئی بات،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ۔ تو ہم پکڑ لیتے اس کو داہنے ہاتھ سے، اور کاٹ ڈالتے اس کی شاہ رگ۔

اسی نازک ذمہ داری کا احساس تھا جس کے تحت نبی صلعم بسا اوقات تشویش فرماتے تھے اور بہ تقاضائے بشریت اس فکر میں رہتے تھے کہ کہیں کوئی لفظ بھول نہ جائیں، کہیں حافظہ کوتاہی نہ کر جائے، کہیں ترتیب میں فرق نہ آجائے۔ لیکن اس فکر اور اس تشویش سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کو اطمینان دلایا کہ لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ۔ یعنی آپ فکر میں نہ پڑیں جلدی سے اس کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، اطمینان سے وحی کو اخذ کریں، اس کو آپ کے ذہن میں ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھنا اور اس کی تلاوت ٹھیک ٹھیک کرا دینا خود ہمارے ذمہ، یہ ہمارا اپنا کام ہے اور اس کے لیے ہم خود خاص اہتمام رکھتے ہیں!

اس فریضۂ تلاوتِ آیات کی ادائی بھی اللہ تعالیٰ کو قاصدانہ انداز سے مطلوب نہیں تھی بلکہ پیغمبرانہ اور داعیانہ انداز سے مطلوب تھی! یعنی چاہا یہ گیا ہے کہ تلاوتِ آیات اس انداز سے ہو کہ ایک جاندار دعوت وجود میں آئے۔ تلاوت محض پڑھ دینا اور بول دینا نہ ہو بلکہ اس کے اندر داعیانہ جذبات گھلے ملے ہوں اس میں مخاطب کے ذہن میں نفوذ کرنے اور اس کے افکار و نظریات کو تہ و بالا کرنے کی طاقت ہو، وہ ایک ذہنی تحریک بن کے فضا میں طاری و ساری ہو جائے۔ طوطے کی طرح پڑھنا مطلوب نہیں تھا، ——— اور قاصد کو توطوطا ہی ہونا چاہیے! ——— تلاوتِ آیات کی جو نوعیت مطلوب تھی اس کا مطالبہ مختصراً اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا۔ قرآن پڑھا جائے اور آیات سنائی جائیں تو ایک قاصد کی طرح بے جان الفاظ نہ اگل دیے جائیں، بلکہ بولنے کا انداز موثر ہو، اس میں کلام کے لیے سچا جذبۂ عقیدت و تصدیق موجود ہو، لہجہ اور تلفظ درست ہو، تجوید کے تقاضے پورے ہوں، اوقاف اور سکوت کے مقامات کا لحاظ ہو، آواز کا آتار چڑھاؤ معانی کے ساتھ ساتھ واقع ہو، اور آیات سچے جذبات کی لہروں پہ تیرتی ہوئی ہر طرف چھا جائیں۔ یہ بات تھی جسے اللہ تعالیٰ نے چار لفظوں میں سمیٹ کر اپنے نبی کے سامنے رکھا اور نبیؐ نے ان چار لفظوں سے وہ سارا مفہوم اخذ کر لیا جسے آج ہم خود اس نبی سے نمونۂ ترتیل اخذ کیے بغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

از خود کبھی نہ سمجھ سکتے!

اب اگر نبی کی پوزیشن محض پیغام پہنچانے والے کی ہوتی تو بس اُس کا کام یہاں ختم ہو جاتا اور آگے کی ساری ذمہ داریاں مخاطبین پر عائد ہو جاتیں۔ لیکن واقعہ یوں ہے نہیں۔ نبی کے ذمّے کام اور بھی ہے۔ وہ ہے تعلیمِ کتاب!

تعلیمِ کتاب

یہ تعلیمِ کتاب کیا چیز ہوئی جب نبی صلعم نے خدا کی آیات کو جوں کا توں پڑھ دیا اور لوگوں کی اپنی زبان میں، بڑی سادہ زبان میں، بڑی فصیح زبان میں، بڑے دلنشیں انداز کے ساتھ پیغامِ الٰہی کو بندوں کے پردہ ہائے سماعت تک پہنچا دیا تو کیا تعلیمِ کتاب اس کے علاوہ کچھ اور ہوتی ہے؟ اگر تعلیمِ کتاب بس یہی ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تلاوتِ آیات" اور "تعلیمِ کتاب" کیا ہم معنی کلمات ہیں؟ ایسا ہے تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ سے اس اسرافِ الفاظ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر، یقیناً اگر یہ خدا کا کلام ہے تو تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب میں فرق ہونا چاہیے! جی ہاں، یہ فرق ہے، بہت بڑا فرق ہے!

تعلیم محض الفاظ اور جملوں کی قرأت و تلاوت کو نہیں کہتے معلّم کا کام صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ آواز کی کچھ لہریں پیدا کر دے اور بس وہ لہریں متعلمین کے پردہ ہائے سماعت سے ٹکرا جائیں تو اس کا کام ختم ہو گیا تعلیم اس کو کہتے ہیں کہ جس حقیقت کا فہم مطلوب ہے، معلّم اس کے بارے میں شکوک و شبہات کو صاف کرکے، اس کے متعلق سامنے آنے والے سوالات اور اشکالات کو حل کرکے، مخاطبین کی ذہنی سطح کے اختلافات کے پیشِ نظر اس کو مختلف اسالیب سے قابلِ قبول بنا کر دلوں میں اتار دینے کی تمام ضروری تدبیر کو عمل میں لائے۔ وہ جس امر کے بارے میں چاہتا ہے کہ لوگوں کے اندر اس کے صحیح ہونے کا، اور جس امر کے بارے میں چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کے غلط ہونے کا علم اور شعور پیدا ہو، اس کے بارے میں اس کا کام اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسے صحیح یا غلط کہہ دے۔ بلکہ تفہیم کے سلسلے میں تمام ضروری پاپڑ بیلنا اس پر لازم ہے وہ ایک شے کو اگر اس حیثیت سے لوگوں کے علم میں لانا چاہتا ہے کہ اس شے کو لازماً معمول بنایا جانا چاہیے تو اس کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ اس کو بیان کر دے۔ بلکہ ضروری یہ بھی ہے کہ اگر لوگ اس کو عمل میں لانے کے طریقے یا اس کی صورت کے بارے میں کسی تصریح اور کسی تفصیل کے محتاج ہوں تو وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصریح اور تفصیل بھی کر دے۔ ایک عام و وسیع حکم پیش کرنے کے بعد معلم اس کا ذمہ دار بھی ہے کہ متعین جزئی صورتوں کے بارے میں اگر اس کے شاگرد واضح راہنمائی کے محتاج ہوں تو وہ ان کو رہنمائی دے۔ اسی طرح اگر کسی خاص جزئی حکم سے عام معاملات کے لیے کسی نتیجہ کے نکلنے کا امکان ہو اور یہ امکان سوالات کو ابھار اسے تو معلم کا فرض ہے کہ وہ اس کے اندر کے مضمر عموم کو کھول کر رکھ دے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تلاوتِ آیات کے مقابلے میں تعلیمِ کتاب کا فریضہ زیادہ وسیع ہے اور اس کی حدود بڑی دور رس ہیں۔ واضح رہے کہ کوئی کتاب کتنی ہی شرح و بسط سے لکھ دی جائے وہ اپنی تعلیم کے لیے خود معلم نہیں بن سکتی۔ اسی لیے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے "الکتاب" کے ساتھ ساتھ "الرسول" کو مبعوث کیا ہے۔ ایک طرف تلاوتِ آیات کے ذریعے خدا کے انبیاء و رسل خدا کا پیغام جوں کا توں بندوں تک پہنچاتے ہیں، اور دوسری طرف وہ اس پیغام کے ذہنوں میں اتارنے اور عملی زندگی کی روح بنانے کے لیے مسندِ معلمی پر بیٹھتے ہیں۔ اس مسندِ معلمی پر بیٹھ کر وہ خدا کے پیغام کے الفاظ اور جملوں ہی کو دہراتے نہیں رہتے، بلکہ وہ اپنی زبان سے بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ یہ جو کچھ کہ انبیاء معلمی کی مسند سے کلام کرتے ہیں، یہ آخر کیا مقام رکھتا ہے؟ محض ذاتی خیالات کہ جو اس کے اپنے زمانے کی ہوا میں اڑ کے رہ جائیں؛ یا ان کی کوئی شرعی و دینی اہمیت ہے؟ اگر ان کی شرعی و دینی اہمیت نہیں ہے تو پھر یہ لازماً "بعض الاقاویل" کی تعریف میں داخل ہوں گے، لیکن اس طرح کی بات صرف جہلاء ہی سوچ سکتے ہیں۔ قرآن تو واضح کر رہا ہے کہ نبی کو معلمی کی مسند پر بٹھانے والا خود وہ اللہ ہے جس نے کتاب بھیجی اور تلاوتِ آیات کا فریضہ نبی کے سر عائد کیا۔ پس نبی معلمی کی مسند سے جو کچھ کہے گا وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے عین مطابق ہوگا، اور اس کی دینی و شرعی اہمیت ماننی پڑے گی۔

دیکھیے، تعلیمِ کتاب کی چند مثالیں سامنے رکھ لیجیے۔

آیتِ کنز نازل ہوتی ہے۔ نبی تلاوت کرتا ہے: اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ . . . الخ بڑے سادہ سے الفاظ ہیں، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو لوگ سمجھ نہ جاتے۔ انہوں نے اسے یوں سمجھا کہ سونا چاندی جس کے پاس جمع ہو، وہ مجرم ہے، اور اگر وہ اس کو تمام تر اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف نہ کر ڈالے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو آخرت میں وہ اس عذاب سے دوچار ہوگا کہ اسکے پہلو اور اس کی پیٹھ انہی ٹکلیوں سے تپا تپا کر داغی جائیگی۔ جن کو اس نے سینت سینت کر رکھا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ بے شمار لوگ ہونگے جن کے قبضے میں درہم و دینار۔ سونے چاندی کے زیورات وغیرہ ہونگے۔ اس آیت کا فوری اثر کیا پڑنا چاہیے؟ یہی نہ لوگوں کے سامنے یہ دراوا آجائے کہ کنز ہوگا تو رضائے الہٰی حاصل نہیں ہوگی اور رضائے الہٰی مطلوب ہو تو کنز کو خدا کے نام پر صرف کر دینا لازم ہے ــــ اور نتیجۃً ایک عام گھبراہٹ پھیلنی چاہیے تھی۔ پھر اس گھبراہٹ کو ایک سوال میں ڈھل جانا چاہیے تھا یعنی کیا کوئی شخص سونا چاندی اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے مومن و مسلم رہ سکتا ہے؟ خداتعالیٰ کا صالح بندہ شمار ہو سکتا ہے؟ آخرت میں نجات پا سکتا ہے؟

یہی ہونا چاہیے تھا یا کچھ اور؟

حدیث بتاتی ہے کہ یہی ہوا۔ یہ گھبراہٹ بھی پیدا ہوئی، یہ سوال بھی اُبھرا۔ اور آخر کار یہ سوال نبی صلعم کے سامنے لا رکھا گیا تاکہ اب وہ تلاوت آیات کرنے والی ہستی تعلیم کتاب کا فرض بھی انجام دے۔ اور اس معلم مامور من اللہ نے اپنی مسندِ معلمی پر بیٹھ کر یہ تصریح کی کہ اس آیت میں کنز سے مراد وہ اندوختہ ہے جس میں سے حق اللہ (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ ہو۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ آدمی کا محض سونا چاندی پاس رکھنا جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس جواب سے اطمینان پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اور حدیث گواہی دیتی ہے کہ یہ اطمینان بھی پیدا ہوا۔ پھر اس جواب کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ لوگ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے املاک و اموال سے استفادہ کرنا ترک کر دیتے۔ چنانچہ اس سوسائٹی کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس میں اتباعِ زکوٰۃ کا تو پوری طرح اہتمام تھا لیکن سونا چاندی املاک میں داخل رہے۔ ہر شخص اپنے اپنے بچے ہوئے اموال خرچ کر کے دامن جھاڑ کر کھڑا نہیں ہو گیا۔

اب فرمائیے کہ اس آیت سے جو سوال پیدا ہوا تھا اس کا جواب خود کتاب نے ہی کیوں نہ دے لیا؟ جبکہ آپ اسے ہر لحاظ سے دینی ضروریات کے لیے کافی قرار دیتے ہیں؛ اور جو جواب نبی نے معلمی کی مسند پر بیٹھ کر دیا، کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ جواب کچھ اور دیا گیا تھا، یہ نہیں تھا؟ اور اگر ایسا ثابت کرنا ممکن نہیں ہے تو ارشاد ہو کہ اس جواب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا ایک عامی کی طرح محض ذاتی رائے کی؟ کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک وقتی فیصلے کی؟

جی نہیں! یہ جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس منصب سے دیا ہے جو خود اُس کتاب ہی نے آپ کے بارے میں قرار دیا ہے جس کتاب کو آپ پہنچانے آئے تھے! اس کی اہمیت پوری کی پوری شرعی و دینی ہے۔

اب ایک اور مثال لیجیے۔ قرآن نے مومنین کا جہاں کہیں کوئی نقشہ پیش کیا ہے اور ایمان کا جو تصور دلایا ہے، نیز دوسری طرف گناہ اور معصیت، خصوصاً کبائر کی جو کالی تصویر کھینچی ہے، اُس نے نبی صلعم کی زیر تربیت جماعت پر بڑا اثر ڈالا۔ چنانچہ جماعت میں آہستہ آہستہ ایک تشویش یہ پیدا ہونے لگی کہ آیا کبائر کی مغفرت بھی ہو سکتی ہے؟ آپ کہیں گے کہ کیوں نہیں، قرآن نے تو صاف الفاظ میں آدمی کے لیے توبہ و اصلاح کے دروازے کھولے ہیں۔ لیکن وہاں یہ تشویش ایمان اور معصیت کی منافات کی گہری حس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہاں سوال یہ تھا کہ آدمی نے کفر و ضلالت سے توبہ کی، خدا پر ایمان لایا، نبیؐ کی اطاعت کو قبول کیا۔ ایک ضابطہ سچے دل سے اپنے لیے مانا، آخرت کی عدالت میں جوابدہی کا احساس اپنے اندر ابھارا، تو کیا اس کیفیتِ ایمان کے ساتھ، اس شعوری حالت کے ہوتے ہوئے یہ ممکن بھی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے خلاف اُس کی نافرمانی کر گذرے۔ وہ اگر صریح نافرمانی کرتا ہے تو گویا اس کے ایمان کا معاملہ مشکوک ہے، اور ایمان زندہ ہے تو کم سے کم کبائرِ معصیت کا صدور ناقابلِ فہم ہے۔ یہ تشویش معمولی اور عامی لوگوں میں نہیں، بلکہ اونچے درجے کے متقی صحابہ، اور آنحضور صلعم کی خاص تربیت میں رہنے والے صحابہ کے اندر ایک دور میں عام رہی ہے۔ چنانچہ یہ سوالات کی شکل میں ڈھل گئی۔ یہ سوالات اپنی اصلی صورت میں اگرچہ ہمیں ریکارڈ میں نہیں ملتے لیکن احادیث میں ان کے جو جواب دیئے گئے ہیں وہ خود ان کو سامنے لے آتے ہیں اور احادیث ہی کے ذریعے تشویش کی وہ فضا بھی نگاہوں میں آجاتی ہے جس میں نبی صلعم نے بار بار تصریحات کی ہیں۔

ان سوالات کے جواب میں اس تشویش کا ازالہ کرنے کے لیے کئی مجالس میں، کئی مواقع پر، مختلف صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے اصل حقیقت کو نتھار کر پیش فرمایا ہے۔ خصوصیت سے روایت ابی ذر تو ایسی بداہت سے اُس تشویش اور سوال کی شکل و صورت کو سامنے لے آتی ہے کہ لفظی ریکارڈ کی کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حضرت ابوذرؓ کی رپورٹ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور جاتے ہیں، اور آپؐ کو سفید چادر تانے محوِ استراحت دیکھتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جاتے ہیں (یعنی کوئی خاص پریشان کن امر آپ کے سامنے ہے) اور اتنے میں آنحضورؐ بیدار ہو چکتے ہیں۔ (حضرت ابوذر یہاں سے اپنی گفتگو کو ساقط کر کے، معاً آنحضورؐ کا قول نقل کر دیتے ہیں)۔

آنحضورؐ نے فرمایا:۔

"کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ وہ کہے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، پھر اسی کے اوپر قائم رہنے کی حالت میں مر جائے تو وہ جنت میں نہ جا پہنچے!"

یہ سُن کر حضرت ابوذرؓ (اپنی اسی تشویش کی وجہ سے) اضطراب کے ساتھ پوچھتے ہیں:۔

"اگرچہ اُس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟"

اور آنحضورؐ فرماتے ہیں:۔

"ہاں! اگرچہ اُس نے زنا کی ہو! اگرچہ اُس نے چوری کی ہو!"

حضرت ابوذرؓ کو جیسے اپنے کانوں پر اعتماد نہ ہو رہا ہو (اور یہ اسی تشویش کی وجہ سے)، پھر زور دے کر پوچھتے ہیں:۔

"اگرچہ اُس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟"

اور آنحضورؐ اُن کی تشویش کے ازالے کے لیے پھر فرماتے ہیں کہ:۔

"جی ہاں، اگرچہ اُس نے زنا کی ہو، اگرچہ اُس نے چوری کی ہو!"

اور حضرت ابوذرؓ کو پھر حیرت ہوتی ہے کہ آنحضورؐ یہ کیا فرما رہے ہیں، وہ پھر مزید زور دے کر پوچھتے ہیں:

"چاہے اُس نے زنا کی ہو؟ چاہے اُس نے چوری کی ہو؟"

اور تیسری مرتبہ رسول اللہ بھی جواب کو حرفِ آخر بنا کر لبوں کو جنبش دیتے ہیں کہ:۔

"ہاں، ہاں! چاہے اُس نے زنا کی ہو! چاہے اُس نے چوری کی ہو —— (وہ جنت میں جا پہنچے گا)،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ابوذر کے (اس اضطراب کے) علی الرغم جا پہنچے گا!"

ذرا خیال رہے کہ اس موقع پر سائل حضرت ابوذرؓ ہیں۔ دوسرے مواقع پر نبی صلعم کا یہی خطاب معاذؓ سے ہے، کہیں حضرت عمرؓ سے، اور گوناگوں اطوار کے ساتھ یہ مضمون سامنے آتا ہے، اور کثرتِ روایات بتاتی ہے کہ یہ تشویش کئی صحابہ میں رہی اور کچھ مدت تک رہی، اور بدقت ذہن صاف ہوئے۔ بہر حال یہ سائل ایسے لوگ تو نہ تھے جو خاکم بدہن گناہ کے لیے چور دروازے کھلوانے کے درپے ہوتے ہوں۔ بلکہ گناہ سے بچنے میں اور گناہ سے نفرت کرنے میں پوری سوسائٹی میں پیش پیش تھے۔ ان کی نگاہ میں تو گناہ اتنی خطرناک چیز بن چکا تھا کہ اسے یہ ایمان کے قطعی منافی بلکہ اس کی جڑ کاٹ دینے والا سمجھتے تھے۔ ان کا معاملہ گناہ کے لیے دروازے کھلوانے کا نہیں تھا بلکہ اس سلسلے کی جملہ روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ، انسان کی الجھن یہ تھی کہ جس آدمی سے کبیرہ کا ارتکاب ہوتا ہے تو یہ ارتکاب حالتِ ایمان کی نفی ہے پھر ایسے آدمی کے لیے نجات کہاں!

اسی الجھن کو صاف کرنے کے لیے دوسری آیات میں نبی صلعم نے یہ توضیح فرمائی کہ یہ ٹھیک ہے کہ ایمان اور معصیت باہم منافات رکھتے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ جب آدمی چوری کرتا ہے، زنا کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے تو اس کا ایمان اُس سے الگ ہو جاتا ہے لیکن گناہ کے غلبے سے نکلتے ہی اگر وہ پشیمان ہو کر اپنے آپ کو سنبھالتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے، تو حالتِ ایمان اس کی طرف لوٹ آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کمزوریوں کے نرغے میں آکر اگر کبھی پھسل جاتا ہے تو گناہ ہمیشہ کے لیے اُس پر چپک کر نہیں رہ جاتا، بشرطیکہ وہ اس کی گندگی کو اپنے آپ سے دُور کرنے کے لیے بے چین ہو۔

اب آئیے اور چند باتوں پہ غور فرما لیجیے :-

پہلی یہ کہ قرآن جب اپنا شارح ہونے کے لیے آپ کافی تھا، ہر لحاظ سے مفصل تھا، سادہ و فصیح زبان میں تھا اور حضرت معاذؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے اکابر صحابہ اسے سنتے رہے مسلسل سنتے رہے، اس پر غور و تدبر سے کام لیتے رہے، نیک نیتی کے ساتھ اس کے لفظ لفظ پر عمل کرنے کے لیے کوشاں رہے، تو کیوں ایسا ہوا کہ وہ اس طرح کے اشکال اور اس طرح کی تشویش میں مبتلا ہوئے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری یہ کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے وہ پھر قرآن ہی کی طرف رجوع کرنے کے بجائے آنحضور صلعم کے سامنے کیوں اپنے اشکال اور اپنے سوال لے کے حاضر ہوتے، جبکہ ایک گروہ کے نزدیک قرآن کے الفاظ کو پہنچا دینے سے زیادہ آنحضورؐ کا کوئی منصب تھا ہی نہیں؟

تیسری یہ کہ آنحضورؐ اگر محض قاصد ہوتے تو آپؐ کو حق ہی کیا پہنچتا تھا کہ الفاظ قرآن کے علاوہ کوئی بات اپنی طرف سے تشریح و توضیح کے لیے فرماتے؟

واقعہ یہ ہے کہ صحابہ میں سوالات کا پیدا ہونا بھی فطری تھا۔ اور ان کا نبی صلعم کی طرف اشکال رفع کرانے کے لیے رجوع کرنا بھی برحق تھا، اور نبی صلعم کا اپنی زبان سے ان کے ذہنی حالات کے پیشِ نظر قرآن کے مدعا کو واضح کرنا بھی عین منصبِ نبوت کا تقاضا تھا۔ آپؐ معلمی کی مسند سے اپنے ارشادات نشر کر رہے تھے، پوری تحدی سے کر رہے تھے اور اُن لوگوں کے علی الرغم کر رہے تھے جو کہتے ہیں کہ ہمیں نبی کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر نبی صلعم نے قرآن کے مدعا کی ایک خاص تشریح کی تھی تو وہ ایک ذاتی فعل تھا اور اپنے وقت میں مناسب تھا۔ اب جو سر پھرا چاہے اٹھے اور کوئی دوسری من مانی تشریح کرے، وہ بھی اپنے وقت میں وہی حیثیت رکھے گی جو ایک وقت میں محمد صلعم کی تشریح کی تھی! جی نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیمِ کتاب کی ایک خاص ڈیوٹی پر مامور تھے، اپنی امت کو کتاب اللہ کے الفاظ پہنچا دینے کے ساتھ ساتھ آپ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ علمِ کتاب بھی پہنچا کے جائیں۔ لہٰذا آنحضورؐ کی تعلیمِ کتاب اور کسی دوسرے کی تفسیر و تاویل ہم پلہ نہیں ہیں! چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک! رسول اللہ جو کچھ فرما گئے وہ حرفِ آخر ہے، اس کے پیچھے ایک اتھارٹی ہے، وہ ایک منصب کے تحت ہے۔ ماوشما جو کچھ کہتے ہیں وہ ذاتی مطالعہ و علم کا حاصل ہے، اور اس کی کوئی شرعی و دینی اہمیت نہیں!

تعلیمِ حکمت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کتاب سکھانا اور حکمت سکھانا دونوں باتیں ایک تھیں، خواہ مخواہ محض حسنِ کلام کے لیے تکرار سے کام لیا گیا۔ نبی کے ذریعے جس حکمت کو کسی امت تک پہنچایا جانا ہوتا ہے، وہ پہلے تمام و کمال خود نبی کو دی جاتی ہے۔ یہ "حکمت" جو نبی کو دی جاتی ہے وہ ایک روشن چراغ ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ جس کی لَو سے اس کے پیرو اپنے اپنے چراغ روشن کرتے جاتے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نبی کی حکمت ایک آفتاب ہوتی ہے جس سے آسمانِ انسانیت کے کرتے اپنی اپنی مقدرت اور اپنے اپنے قرب و بُعد کے لحاظ سے اکتسابِ نور کرتے ہیں اور پھر خود نور پاش بن جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے آنحضورؐ نے اپنے رفقائے دین کو ستاروں سے تشبیہ دی تھی کہ ان جھلملاتے تاروں میں سے جس کی کرنوں کو بھی لوگے اور جس سے بھی مسلکِ زندگی کی سمت معلوم کروگے، ہدایت پاؤگے۔ کیونکہ ان کی کرنیں خود فیضانِ رسالت ہیں!

نبی کی پوزیشن اگر قاصد کی ہوتی تو عطیۂ حکمت سے ان کو نوازے جانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انبیاء و رسل کا حکمت سے نوازا جانا خود اس بات پر گواہ ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کا اختیار یافتہ نمائندہ اور اس کا خلیفہ اور اس کا معتمد علیہ سفیر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے منصب کے مطابق اقامتِ دین کا پورا کام کرتا ہے۔

حکمت کہتے کسے ہیں؟

لغت کی طرف جائیے تو وہ اس کا مفہوم واضح کرنے کے لیے "العدل"، "العلم"، "الحلم"، "النبوۃ" کے الفاظ سے کام لیتا ہے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے ٹھیک اپنی جگہ پر رکھی جائے، ہر ایک کو اس کا صحیح مقام دیا جائے، جو چیز جس وزن کی مستحق ہو وہی وزن اس کو دیا جائے، ترازو ہاتھ میں لے کر اس کے پلڑے برابر کر دیئے جائیں، جس کا جو حق ہو وہ اس کو پورے کا پورا دیا جائے اور جس پر جو واجب آتا ہو وہ اس سے پورے کا پورا لے لیا جائے۔ اور جب "عدل" کو "ال" کے ساتھ زور دے کر خاص اصطلاحِ دینی میں بولا جائے تو مفہوم ہوگا زندگی کے معاملات کو صحیح عقائد و نظریات پر بالکل توازن سے استوار کرنا، افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ پر گامزن ہونا، حرام کو حرام کی جگہ اور حلال کو حلال کی جگہ رکھنا، زیادہ اہم کو زیادہ اہم اور کم اہم کو کم اہم سمجھنا، جو جس کے حقوق ہیں وہی اس کے حقوق قرار دینا، نہ ان کو گھٹانا، نہ بڑھانا۔ علم کا مطلب یہ ہے کہ جاننے کی چیز کو جانا جائے، اور کما حقہٗ جانا جائے، ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کو جانا جائے، غرض اور مصلحت اور مقصد کو جانا جائے، اجمال کے اندر جو تفصیل مستتر ہے اسے جانا جائے اور اشارات سے مشار الیہ کو معلوم کیا جائے۔ اور جب یہ خاص دینی اصطلاح بن جائے تو اس کا مدعا یہ ہوگا کہ ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیادی حقیقتوں پر عبور حاصل کیا جائے جن پر کائنات اور انسانی زندگی کی بنیاد قائم ہے، جو ہنگامۂ وجود کی شرح رواں بن کر کام کر رہی ہیں، خدا کے احکام اور ان کے منشاء و منطوق کو جانا جائے، خیر اور شر اور حلال اور حرام میں فرق کرنے والے اخلاقی وجوہ و اسباب کو معلوم کیا جائے۔ اور حلم سے مراد جذبات کے توازن کی حالت ہے جو "جہالت" (عربی مفہوم کے ساتھ) کی عین ضد ہے۔ نہ کوئی فطری جذبہ اپنی حد سے بڑھنے پائے اور نہ کوئی فطری جذبہ اپنی حد سے کمزور ہونے پائے۔ بلکہ سارے کے سارے جذبات اپنی اپنی جگہ حالتِ اعتدال پر کام کریں، کوئی کسی دوسرے کو دبانے والا نہ ہو۔ نیز حلم اس حالت کا نام ہے کہ جذبے اور عقل کے درمیان بھی ٹھیک تناسب موجود ہو۔ وہ اپنا وظیفہ فطری حدود میں انجام دے، یہ اپنا فریضہ اپنی فطری حدود میں صحیح صحیح طریقے سے پورا کرے۔ ذہن اور روح اور قلب کو اس حالتِ توازن پر قائم رکھنے کا نام حکمت ہوا۔ اور نبوت سے یہاں مراد محض عہدۂ نبوت نہیں، کارِ نبوت ہے یعنی ایک نبی اپنے پھیلے ہوئے گوناگوں فرائض کو ادا کرنے کے لیے جس خاص فہم و بصیرت، جس خاص عدل اور جس خاص حلم سے اور جس خاص تکنیک اور اسلوب پر قدم قدم کے مختلف حالات اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کام لیتا ہے۔ وہ حکمت سے موسوم ہے۔ کارِ نبوت حکمت کے بغیر ممکن ہی نہیں!

خدا نے خود اپنے کو صاحبِ حکمت بتایا ہے۔ اس کے ناموں میں سے ایک نام ہی "حکیم" ہے اور یہ نام قرآن میں بے شمار مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ قرآن میں خدا کی یہ صفت جہاں بھی بیان ہوئی ہے یہ واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہے کہ کارخانۂ کائنات کے بنانے میں، انسان کو پیدا کرنے میں، زندگی کے قوانین مقرر کرنے میں، شرائع کے نافذ کرنے میں، ایک سوچا سمجھا منصوبہ کام کر رہا ہے۔ ایک مقصدیت ہے جو "کن" کی ہر لہر میں مضمر ہے۔ ایک توازن و اعتدال ہے جو ذرّے کی بندش سے لے کر نظامِ شمسی تک، ہر طرف نمودار ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اندھا دھند نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس کے زیرِ حکم جو بناؤ اور جو بگاڑ واقع ہوتا ہے، جس گوشے میں تخریب اور جس گوشے میں تعمیر ہوتی ہے۔ ایسے قوانین و ضوابط کے تحت ہوتی ہے جن کی بنیاد بڑی بھاری مصلحتوں پر رکھی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی حکمت کا پرتو ہے جو اللہ تعالیٰ عقائد و احکام اور اخلاق و آدابِ شرعیہ کے معاملے میں اور نظامِ حق کے بارے میں اپنے انبیاء پر ڈالتا ہے اور پھر اس کا عکس مومنین صالحین پر پڑتا ہے۔ نبی علم، عدل اور حلم کے کمالات سے متصف ہو کر کتابِ الٰہی کی سطور کے بین السطور کو جب پڑھتا ہے تو وہ اس توازن کا رازداں بن جاتا ہے جو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا لازمہ ہے۔ وہ فکر و عمل کی بنیادوں میں عدل کے چھپے ہوئے تقاضوں کو سمجھ لیتا ہے، وہ اصول و احکام کی ترتیب مدارج کا شعور حاصل کر لیتا ہے، وہ اشاروں اشاروں سے منشاءِ الٰہی کو اخذ کر لیتا ہے، وہ حلّت و حرمت کے اخلاقی موجبات کو پا لیتا ہے، اس کی نگاہ افعالِ مطلوب اور افعالِ مردود کے بعید مقاصد کو پا لیتی ہے، وہ الفاظ کو عمل کا جامہ پہنانے کے بہترین اسلوب پر دسترس حاصل کر لیتا ہے، اور پھر وہ کسی منشاءِ الٰہی کو، روزمرہ کی زندگی کے مختلف احوال اور انسانی کرداروں کے گوناگوں مظاہر کے درمیان نافذ کرنے کے بہترین پیرائے جان جاتا ہے۔ یہ ہوتی ہے حکمت جسے نبی تبلیغ کے کام میں بھی، جماعت کی تنظیم کے کام میں بھی، تعلیم و تزکیہ کے کام میں بھی، تحریک کو آگے بڑھانے کے کام میں بھی اور ایک ریاست چلانے کے کام میں بھی اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی و ہدایت استعمال کرتا ہے، اور جس کی تعلیم وہ اپنے سارے ہی پیروؤں کو دیتا ہے، نیز جس سے وہ غیر معمولی خلوص و ذہانت رکھنے والے خاص خاص رفقاء کو اس حد تک آراستہ کرنے میں ساری عمر لگا دیتا ہے کہ وہ اس کے بعد اسی حکمت کے معلم بن سکیں۔

دینی اصطلاح میں یہ حکمت اتنا بلند مقام رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے خیرِ کثیر قرار دیا ہے۔

آج کل کے جہلاء نے اس اصطلاح کو اس کے اس مفہوم سے آشنا کر دیا ہے کہ ہر خرافی فلسفے پر اور ہر سائنس پر اور ہر تعلیم پر جو مغرب کی طرف سے دی جا رہی ہو بلا تکلف اس کو چپکا دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے اس کو ایسے گھٹیا معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ قرآن اس حکمت کا ذکر کر رہا ہے جو انبیاء کو دی گئی اور جس کی تعلیم دینے پر ان کو مامور کیا گیا!

یہ حکمت ایسی چیز نہیں ہے جسے چند ابواب اور فصول کے تحت کسی کتاب میں سمیٹ کر دنیا کے حوالے کر دیا جائے۔ آخر کیا آپ یہ مان سکتے ہیں کہ عام دنیوی سوجھ بوجھ ایسی چیز ہے جسے کسی انسائیکلوپیڈیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھر کر ہر آدمی کو پڑھا دیا جا سکے ؟ کیا سوچنے، رائے قائم کرنے، توازن ذہنی سے کام لینے، بھلے برے کی پرکھ کرنے کی صلاحیت کوئی ایسی جنس ہے کہ کونین کے پاؤڈر یا نفشے کے پھولوں کی طرح اس کی پڑیاں بنا کر ضرورت مندوں کو دے دی جائیں کہ اس کی اتنی خوراکیں کھا لینا تو تم ایک دانش ور آدمی ہو جاؤ گے ؟ ہرگز نہیں ! ــــ تو کیا دینی اصطلاح میں جس چیز کو حکمت کا نام دیا گیا ہے وہ ایسی ہو سکتی ہے کہ ایک کتاب لوگوں کے ہاتھ میں دے کر کہا جائے کہ جاؤ اب تم حکیم بن جاؤ گے ؟ یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے ؟

حکمت تربیت سے پیدا ہوتی ہے، اور اگر بات تصوف کے میدان میں نہ جا ڈالی جائے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فیضانِ نظر سے اس کی آبیاری ہوتی ہے۔

انفرادی مذہب داری کے لیے فقہ کے ضابطے ممکن ہے کہ کافی ہو جائیں اور گنے چنے اوامر و نواہی کی ایک فہرست سامنے رکھ لینا آدمی کے لیے بس کرتا ہو، لیکن ایک اجتماعی دین، ایک تحریک اور ایک نظام فقط ضوابط اور احکام کی فہرستوں کے بل پر نہیں چلتا، اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس کے علمبرداروں میں حکمت کا ذخیرہ ہو۔ یہی کام ہے جو تعلیم کتاب کے ساتھ نبی کرتا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن کے اندر سرے سے حکمت کی تعلیم موجود نہیں ہے۔ یقیناً ہے۔ حکمتِ دینی جن اصولوں پر مبنی ہے ان کو قرآن نے جابجا بیان کیا ہے اور بعض مقامات پر اس حکمت کے تقاضوں کی طرف اشارات کر دیے ہیں۔ لیکن بہر حال ایسا عملاً ممکن نہیں ہے کہ حکمت پر کوئی مضمون شائع کر کے کام چلایا جا سکے۔ حکمت کی تربیت کے لیے کتاب کے ساتھ رسول کا ہونا بڑا ہی ضروری تھا۔ کیونکہ کتاب تو حکمت کی طرف صرف اشارے کر سکتی ہے۔ عملی تربیت تو ایک مربی ہی دیا کرتا ہے۔

آئیے تعلیم حکمت کی چند مثالوں پر بھی نگاہ ڈال لیں۔

(۱) ابی امامہ کی رپورٹ ہے۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ما الایمان ؟ ایمان کس حالت کا نام ہے ؟ (ظاہر بات ہے کہ نبی صلعم کی دعوت پر اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا فطری امر تھا)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے جواب میں نبی صلعم دوسری روایات کی طرح یہ جواب نہیں دیتے کہ خدا، انبیاء، کتب، فرشتوں اور آخرت کے ہونے پر یقین رکھنے کا نام ایمان ہے، بلکہ سائل کے خاص منشاء کو سمجھ کر کیفیتِ ایمان کو واضح فرماتے ہیں:-

"جب نیکی تجھے فرحت دے اور برائی تجھے دکھ پہنچائے تو تو ایمان کی حالت میں ہے"!

پھر اُس نے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! گناہ کی کیفیت کیا ہے؟

نبی صلعم نے جواب دیا: "یہ کہ کوئی چیز تیرے ذہن میں کھٹکے"!

دیکھیے یہاں بھی آپؐ نے گناہوں کی فہرست نہیں سنادی، بلکہ سائل کا منشا سمجھ کر حکیمانہ طریق سے اس پر گناہ کی کیفیتِ نفسی کو واضح کیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پوچھنے والا مسلم ہے، ایمان رکھتا ہے، حق و باطل کو جانتا ہے، مطلوبات اور ممنوعات اس کے سامنے ہیں، وہ مسلم سماج کے ایسے ماحول میں رہتا ہے جس میں رشد و غی مبہم و مرکب نہیں ہیں، بلکہ ممیز ہو چکے ہیں اور جس میں انسانی فطرت آلائشوں سے پاک ہو کر نکھر آئی ہے، اس لیے سائل کو آپؐ نے اس کے حالات کے مطابق حالتِ ایمان اور کیفیتِ گناہ کا ایک نفسیاتی پیمانہ دے دیا۔

یہ پیمانہ اس متعین سادہ شکل میں قرآن میں کہاں پیش کیا گیا ہے؟

لیکن یہ پیمانہ قرآن سے متعارض کہاں ہے؟

قرآن کے موافق ہے تو کیا نبیؐ نے محض ذاتی رائے سے یہ ایک فلسفہ (نعوذ باللہ) گھڑ ڈالا، یا عین منشاء الٰہی کو واضح کیا۔

کیا ایمان و گناہ کی اس تعبیر کو رد کر کے کوئی شخص اگر کوئی دوسری تعبیر اس سے متضاد اختیار کرے تو وہ ایمان بالرسالت پر قائم رہ جائے گا؟ ——— ہرگز نہیں! اُس نے نبی صلعم کی حکمت اور تعلیم حکمت کو رد کر دیا جو آپ باضابطہ سرکاری حیثیت سے دے رہے تھے۔

(۲) قرآن میں اسلام کے مخالفین و اجانب سے "تولّی" کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ظاہر بات ہے کہ جو لوگ اسلام کے فلسفہ و اصول اور ضابطہ و مسلک کے مخالف ہوں، جن کی دن رات کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرگرمیاں اس کی مخالفت کے لیے وقف ہوں، جو اس کی قوت کو توڑنے کے درپے ہوں اُن سے کسی مسلمان کا قلبی میلان ہونا، ان میں محبت آمیز طریق سے خلا ملا، ان سے مشورہ و رازداری کا تعلق ان پر اعتماد اور بھروسہ حمیّت و غیرت کے بھی خلاف ہے اور نتائج کے لحاظ سے بھی اسلامی معاشرے کے لیے مہلک ہے۔

قرآن نے دشمنانِ حق سے تولّی کو حرام قرار دیا تھا، لیکن نبی بہ حیثیتِ معلّمِ حکمت "تشبّہ" کو بھی ممنوع ٹھیراتا ہے۔ کیا یہ تعلیمِ حکمت قرآن کے خلاف ہے؟ کیا یہ اضافہ ہے قرآن کی تعلیم پر؟ یا درحقیقت یہ حُرمتِ تولّی کا عین تقاضا ہے کہ تشبّہ بھی حرام ہو؟ اگر حقیقت یہی ہے تو حرمتِ تولّی سے حرمتِ تشبّہ نبی کے سوا اور کون اخذ کر سکتا تھا؟ اور کر بھی لیتا تو اس کو سندِ اعتبار کیسے حاصل ہوتی؟

نبی و رسول کی نگاہِ دُور رس، جو اللہ تعالیٰ کی چشمِ کرم کے فیضانِ نگاہ سے تربیت پاتی ہے، صاف صاف دیکھتی ہے کہ تشبّہ یا تو علامت ہے تولّی کی یا غیرت و حمیّتِ اصول و مسلک کے اُس فقدان کی جو بالآخر تولّی ہی پر منتج ہو سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان اگر رہن سہن، طور طریقوں اور وضع قطع میں کسی دشمنِ اسلام گروہ کے ساتھ ہم رنگی رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ابھی تک اپنے اندر اپنے اصول و مسلک کو اس طرح محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ اپنے آپ کو کفار اور مشرکین کے مقابلے میں ایک جداگانہ حیثیت کے ساتھ نمایاں کرتا اور ان کے ساتھ اپنے آپ کو گڈمڈ کرنے یا ان کی تقلید کرنے میں کراہت محسوس کرتا۔ ایمان کی وہ لکیر ابھی اُس نے کھینچی ہی نہیں جو مومن و کافر کو جدا کر دیتی ہے، جو خدا پرستی اور مخلوق پرستی میں، جو سچ اور جھوٹ میں، جو انصاف اور ظلم میں، جو اصول پسندی اور بندگیٔ مفاد و اغراض میں، جو حیا و عصمت اور فسق و فجور میں، جو معروف اور منکر میں حدِ فاصل بن جاتی ہے۔ اس کے اندر اگر اپنے اصول، اپنے دین اور اپنے مسلک کے امتیاز کا شعور بیدار ہوا ہوتا تو یہ شعور اس کے مسام مسام سے پھوٹا پڑتا، یہ اس کے چہرے سے ٹپکتا، یہ اس کے لباس اور اس کی وضع قطع میں نمایاں ہوتا، یہ اس کے پسندیدہ آداب و اطوار میں صاف صاف جھلکتا۔ لیکن اگر اس کا پورا ظاہر تشبّہ بالاجانب کی حالت کا مظہر ہے تو وہ گواہ ہے اس کے باطن پر کہ اس کا باطن اس کے اصول و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلک کی امتیازی حیثیت کے احساس سے خالی ہے۔

پس جہاں تشبہ ہوگا، وہاں تولی بھی آکے رہے گا اور جہاں تولی موجود ہوگا وہاں کوئی وجہ نہیں کہ تشبہ نہ پایا جائے۔ یہ دو لازم و ملزوم مفاسد ہیں اور ان میں سے ایک کی حرمت لازماً دوسرے کی حرمت اپنے اندر مضمر رکھتی ہے۔ ایک کی حرمت اگر مسطور قرآن میں بیان ہوئی ہے تو دوسرے کی بین السطور میں بیان ہوگئی ہے اور بین السطور کا فہم ـــــ کامل فہم اگر ہو سکتا ہے تو نبی و رسول کو ہو سکتا ہے اور وہی مستند شارح ہے اس طرح کے تمام مضمرات قرآنی کا!

نبی و رسول مجرد احکام سنا دینے والا پیادہ (نعوذ باللہ) نہیں ہے بلکہ وہ احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے، اس کی نگاہ ان کے مقاصد پر ہوتی ہے، وہ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ بھی جانتا ہے کہ ایک حرمت لازماً اور کن کن حرمتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شراب پینے کی حرمت کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ بہ حیثیت حکیم اور معلمِ حکمت کے اس کی کشید اور اس کی خرید و فروخت کو بھی حرام ٹھیرا دیتا ہے۔ اوپر سے شراب کو ممنوع ٹھہرایا جاتا ہے اس کے نشہ کے مفاسد بیان کر کے۔ وہ نشہ آور مقدار کے ساتھ ساتھ غیر نشہ آور مقدار کو بھی خلافِ قانونِ الٰہی قرار دیتا ہے، کیونکہ غیر نشہ آور مقدار ذریعہ بن سکتی ہے آدمی کو نشہ آور مقدار تک پہنچانے کا: اسے جبریل کے ذریعے حُرمتِ ربٰو کا حکم ملتا ہے، لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ "ریبہ" (وہ معاملہ جس میں سودی معاملے سے مشابہت پائی جائے اور وہ مشکوک نوعیت کا ہو، یا جس سے سود کے لین دین کے چور دروازے نکالے جا سکتے ہوں) کو بھی ناجائز قرار دیتا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟

ـــــ تعلیم حکمت!

(۳) ترمذی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب (ذہن) میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ اس سے باز آجاتا ہے، توبہ و استغفار کرتا ہے تو اس کا قلب پھر جلا پا جاتا ہے۔ اور اگر وہ گناہ کی تکرار کرتا ہے تو وہ نقطہ پھیلتا ہے، تا آنکہ قلب پر چھا جاتا ہے، اور یہی ہے وہ پردہ جس کو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ روایت بتاتی ہے کہ گناہ کا عمل نفسیاتِ انسانی کی دنیا میں کس طرح واقعہ ہوتا ہے حقیقت کی کیا ہی صاف اور سادہ تعبیر ہے کہ گناہ کا نشوونما بھی اسی قانون کے عین مطابق ہے جو پوری کائنات میں کار فرما ہے۔ پہلے ایک ننھا سا بیج پڑتا ہے، اُس بیج کو اگر زمین قبول نہ کرے اور وہ مرجائے تو زمین اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے، ورنہ اگر وہ قبول کرلے اور اس کو غذا دینے لگے تو وہ پروان چڑھنے لگتا ہے، ایک تناور درخت بنتا ہے اور اس کی شاخیں زمین پر چھا جاتی ہیں۔ ایک جرثومۂ مرض کیا چیز ہوتا ہے؟ خوردبین سے بھی بمشکل محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ بدن میں داخل ہوتا ہے اور بدن فطرۃً اس کی مدافعت کرتا ہے۔ لیکن اگر مدافعت کمزور ہوتی ہے تو وہ اپنی جگہ پیدا کر لیتا ہے، پھر وہ ایک سے دو، دو سے چار ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ جرثوموں کی فوج کی فوج انسانی صحت کی سلطنت پر چھا جاتی ہے۔ گناہ کی ماہیتِ عمل بھی بالکل ایسی ہی ہے۔

نبی صلعم نے یہ حکمت جو بیان فرمائی، یہ ایک لطیف حقیقت جو واضح کی تھی تو یہ محض نکتہ آرائی نہ تھی، یہ ایک ایسے ماحول کے روز مرہ کے عملی تقاضوں کا جواب تھی جس میں بدی اور گناہ کے خلاف نیکی کے سپاہی جنگ لڑ رہے تھے اور اس جنگ کا اولین محاذ خود ان کے اپنے نفوس تھے۔ وہ ضرورت مند تھے اس کے کہ ان کو اپنے عالمِ نفس کی کیفیات کی بصیرت حاصل ہو، وہ محتاج تھے اس کے کہ گناہ کے نفسیاتی عمل کو جانیں۔ چنانچہ خدا کے رسولؐ نے ان کو یہ حیثیت معلّمِ حکمت کے ان حقائق سے روشناس فرمایا، تاکہ بدی کے اولین جرثومے کے داخل ہوتے ہی ان کی قوتِ مدافعت چوکنّی ہو جائے۔

(۸) قرآن میں میدانِ جنگ کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق بیان کیا گیا ہے۔ یہ ضابطۂ اخلاق موٹے موٹے اہم اصولوں پر مشتمل ہے۔ ان اصولوں کے اندر ان کے کچھ اپنے تفصیلی تقاضے بھی مضمر ہیں لیکن اُن تقاضوں کو ان اصولوں کے باطن سے جوں کا توں برآمد کر لینا بدرجۂ کمال اگر ممکن ہے تو صرف محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی معصوم بصیرت کے ذریعے ممکن ہے۔ مثلاً آپ کو قرآن میں یہ ہدایت تو صاف صاف لفظوں میں ملتی ہے کہ دشمن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرو، زیادتی کا جواب دو مگر شریفانہ طریق سے دو، حد سے آگے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ نکل جاؤ، لیکن خود اس "زیادتی" اور اس "حد سے نکل جانے" کی عملی شکلوں کو قرآن نے نمبروار فہرست کی صورت میں بیان نہیں کیا ہے، بلکہ یہ کام رسول کے ذمے چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے اس "زیادتی" اور اس "حد سے نکل جانے" کا مفہوم عملی دنیا میں عملی طریقوں سے وقتاً فوقتاً متعین فرمایا۔ قرآن کی جو حکمت بین السطور میں مخفی تھی اسے اللہ تعالیٰ کے مامور کردہ معلم حکمت نے نکھار کر پیش کر دیا، اشارات کو کھول دیا، الفاظ کے منطوق کو بے نقاب کر دیا، کتاب کے مضمرات کو عام فہم صورت میں پیش کر دیا۔ مثلاً:-

عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، قال وجدت امرأۃ مقتولۃ فی بعض مغازی رسول اللہ فنہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قتل النساء والصبیان (السنۃ الا النسائی)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا: رسول اللہ کی قیادت میں ہونے والے کسی غزوہ میں میں نے ایک عورت کو مقتول دیکھا، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی ممانعت فرما دی۔

اذا قاتل احدکم فلیجتنب الوجہ (الشیخان)

جب تم میں سے کوئی لڑے تو اسے چاہیے کہ حریف کے چہرے پر ضرب لگانے سے پرہیز کرے۔

عن ابی یعلی، قال: غزونا مع عبد الرحمن ابن خالد ابن الولید فاُتی باربعۃ اَعلاج من العدو فامر بہم فقتلوا صبرا بالنبل فبلغ ذلک ابا ایوب الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فقال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینہی عن قتل الصبر ـــ فوالذی نفسی بیدہ لو کانت دجاجۃ ما صبرتہا، فبلغ ذالک عبد الرحمن فاعتق اربع رقاب (ابوداؤد)

حضرت ابو یعلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ایک لڑائی میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے ساتھ شریک تھے۔ تو ایسا ہوا کہ چار اجنبی دشمن گرفتار کر کے لائے گئے۔ پھر حضرت ابن خالد نے ان کے بارے میں حکم صادر کر دیا اور وہ باندھ کر تیروں سے مار ڈالے گئے۔ اس کے بعد حضرت ابو ایوبؓ انصاری کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو باندھ کر قتل کرنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے، اس لیے قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر ایک مرغی بھی ہوتی تو میں اسے باندھ کر نہ مارتا۔ اب جو حضرت عبدالرحمٰن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(خالد بن ولید) کو اطلاع ہوئی تو آپ نے (اس سہو کے کفارہ

کے طور پر) چار غلام آزاد کیے۔

علاوہ بریں دشمن کی لاشوں کا مثلہ کرنے سے بھی آنحضورؐ نے منع فرمایا ہے۔

اب ان ارشادات نبوی کو سامنے رکھیے اور پھر سوچیے کہ کیا یہ چیزیں قرآن پر اضافہ ہیں اور اس کی اصولی ہدایات کے متعارض ہیں یا اُن اصولی ہدایات کا ٹھیک عملی تقاضا ہیں؟ کیا قرآن نے جہاں "اعتداء" یا زیادتی کرنے سے روکا ہے وہاں یہ سوال خود بخود نہیں پیدا ہو جاتا کہ اعتداء میں کیا امور شامل ہیں اور کیا اس سے باہر ہیں۔ اور اگر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے تو اس کا ایک قطعی جواب ہونا چاہیے یا نہیں؟ اگر ہونا چاہیے تو کیا واقعی اس سوال کا پورا جواب قرآن کے الفاظ میں موجود ہے؟ اگر نہیں تو اس کا جواب دینے والی اتھارٹی کہیں ہونی چاہیے یا نہ ہونی چاہیے؟ اور یہ اتھارٹی اگر رسول اللہ کے پاس ہو جیسا کہ واقعتہً ہے تو فرمائیے اس کے خلاف اعتراض کیا ہے، دلیل کیا ہے، شکایت کیا ہے؟

رسول اللہ قرآن کی ان ساری ہدایات کا کامل شعور رکھتے تھے جو قرآن نے اصولاً دی ہیں، آپؐ ان کے مجموعی مزاج کو اس حد تک جانتے تھے جس سے زیادہ جاننا ممکن نہیں ہے، ان کے مجموعی مزاج کی روشنی میں آپؐ ان کے تفصیلی عملی تقاضوں کا اتنا مکمل فہم رکھتے تھے کہ کوئی دوسرا اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔ بنا بریں آپ ہی احق تھے کہ "اعتداء" کا عملی مفہوم واضح فرمائیں۔ اجتہاداً اگر کوئی دوسرا آدمی ایک وقتی فیصلے کے طور پر اعتداء کا صحیح مفہوم پیش کر بھی دکھائے تو چونکہ اس کے اندر شرعاً اتھارٹی موجود نہیں ہے، لہٰذا اس کے اجتہاد کا یہ احترام نہیں ہو سکتا کہ دشمن چاہے یہ ساری زیادتیاں مسلمانوں کے ساتھ کر گذرے لیکن مسلمان اُن سے محض اس بنا پر احتیاب کریں کہ خدا و رسول کا حکم ہے، یہ ان کا دین ہے اور اس پر ان کی عاقبت منحصر ہے، اور نہ اس اہتمامِ تقویٰ کا ظہور ہو سکتا ہے کہ ایک صحابی اس حکم کو سننے کے بعد ایک مرغی کو بھی باندھ کر ذبح کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

اب ذرا ارشاد ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ان ہدایات میں سے کونسی ایسی ہدایت ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ تو واضعین حدیث نے گھڑ کر دفترِ روایات میں شامل کر دی ہے؛

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا یہ ایک سازش کا نتیجہ ہے جو دین کو تباہ کرنے کے لیے کی گئی تھی، یا یہ قرآن سے ٹکراتی ہے؟ یہ ہدایات خود بول بول کر کہہ رہی ہیں کہ ہم میں سے ایک ایک قرآنی ضابطۂ جنگ کے فریم میں اپنی جگہ رکھتی ہے اور اُس جگہ پر ٹھیک فٹ آتی ہے۔ آپ ان میں سے کس کے مقابلے میں حالات زمانہ کے تقاضے کے تحت اجتہاد فرما کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں گے؟ کیا آپ اب غیر مصافی عورتوں اور بچوں پر تلوار اٹھایا کریں گے؟ کیا آپ دانستہ دشمن کے چہرے پر ضرب لگایا کریں گے؟ کیا آپ دشمن کو باندھ باندھ کر مارا کریں گے؟ کیا آپ حریف کے لاشوں کے ناک کان کاٹا کریں گے؟ کیا آپ حکمت نبوی کے جلائے ہوئے ان سارے دیوں کو گل کر کے اپنی حکمت کے بل پر زیادہ بہتر فانوس روشن کر سکتے ہیں؟ ممکن ہے کہ آپ اس زعم میں مبتلا ہوں، لیکن قرآن آپ کے اس زعم کو نہیں مانتا۔ قرآن تو رسول اللہ صلعم کو اپنی حکمت کا معلم مقرر کرتا ہے اور آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ کی حکمت اصل معلم حکمت کی حکمت کے تابع رہے۔ اگر وہ اس کے تابع نہ رہے تو پھر وہ آپ کی حکمت کو جہالت سمجھتا ہے۔ آپ کتنے بڑے حکمت مآب کیوں نہ ہوں، آپ تعلیم حکمت کی اُس مسند پر نہیں بیٹھ سکتے اور اس مسند سے نہیں بول سکتے جو رسول اللہ کے لیے خاص ہے۔

(۵) قرآن نے حکومت و سیاست کے اصول بھی بیان کیے ہیں۔ اور اتنی وضاحت سے بیان کیے ہیں جتنی کہ "فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا" کے الفاظ کا تقاضا ہے۔ مگر ان اصولوں پر جب آپ عملاً ایک ریاست برپا کرنا چاہیں تو دن رات بے شمار ایسے اصولی مسائل سامنے آئیں گے جن کا جواب الفاظ قرآن میں صاف صاف طریق سے نہیں ملے گا، بلکہ اس کے بیان کردہ اساسی اصولوں کے اندر مضمر ہوگا۔ اور صرف ایک گہری نگاہ رکھنے والا حکیم ہی یہ اندازہ کر سکے گا کہ یہ اساسی اصول کن عملی احکام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ کا رسول ایسی ہی گہری نگاہ سے آراستہ تھا اور آپ نے سیاسی نظام کے متعلق بعض امور ایسے طے کر دیئے ہیں کہ جن کو اگر کوئی شخص قرآن کے کسی ایک فقرے میں ڈھونڈنا چاہے تو اسے ان کا نام ونشان بھی نہ ملے گا۔ لیکن اگر وہ رسول کی حکمت کی روشنی میں دیکھے تو سارا قرآن انہی امور کے حق میں ناطق ہوگا۔ چنانچہ نبی اکرم نے عورت کے ہاتھوں میں نظام سیاسی کی زمام اقتدار دیئے جانے کو روکا ہے۔ آج کل کا ایک مجتہد جب احادیث میں اس ممانعت کو پڑھے گا تو وہ ضرور پیچ وتاب کھائے گا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر وہ انڈکس کے ذریعے قرآن کی ورق گردانی کر کے جب پوری طرح مطمئن ہو جائے گا کہ اس طرح کی ممانعت قرآن کے کسی فقرے میں نہیں آئی تو وہ کہے گا کہ یہ روایات قطعی طور پر ملاؤں کی سازش ہیں، آخر خدا کے دین میں کوئی ایسی ممانعت کیوں کر ہو سکتی ہے جو اس روشن دور کی ترقی یافتہ اقوام کو پسند نہ ہو۔ لیکن اللہ کے رسول نے یہ ممانعت جو کی ہے تو اس عظیم الشان حکمت کے بل پر کی ہے جو معرفت قرآن میں اسے مقام محمود پر لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ جس قرآن کو لایا ہے اس میں خواتین کے لیے صاف صاف ہدایت موجود ہے کہ "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ" یعنی ان کے سر گھروں کی سلطنت کو چلانے کا بار ڈال کر ایک خاص تقسیم کار کی گئی ہے۔ پھر وہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ، یعنی مرد عورتوں پر قوام ہیں اور یہ قوامیت ان کو اپنی فطری فضیلت کی وجہ سے دی گئی ہے۔ اور اللہ کا رسول ان اشارات سے اسلامی سماجی نظام کا پورا پورا تصور اپنے سامنے رکھ کر جب سوچتا ہے تو وہ حکمت کا تقاضا یہی پاتا ہے کہ عورتوں کو سیاست سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ وہ پوری طرح سمجھ جاتا ہے کہ اگر گھروں کے اندر مرد عورتوں کے لیے قوام ہیں تو ریاست کی مجموعی قوامیت کے لیے بھی مرد ہی موزوں ہو سکتے ہیں خواتین نہیں۔ کوئی ایسا نظام معقول طریق سے نہیں چل سکتا جس میں خاندانی اور معاشرتی قوامیت مردوں کے ہاتھ میں ہو، لیکن سیاسی قوامیت عورت کے سپرد کر دی جائے۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہو گا۔ وہ عورتوں کی ان صلاحیتوں کی پوری حقیقت قرآن سے اخذ کر لیتا ہے جن کو اگر ان کے مناسب فطرت کاموں میں لگایا جائے تو بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔ لیکن اگر ان کے مناسب فطرت کاموں سے ہٹا کر ان کو سیاست پر لگا دیا جائے تو کبھی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے جب وہ خواتین کو سیاست سے مستثنیٰ کرنے کے لیے کوئی بات زبان سے کہتا ہے تو وہ از خود نہیں کہتا بلکہ درحقیقت قرآن ہی اس کی زبان سے بولتا ہے، قرآن اس کی زبان سے اپنے اصولوں کی صریح توضیح کرتا ہے، اور وہ اگرچہ قرآن کی کوئی آیت پیش نہیں کر رہا ہوتا مگر وہ قرآن کی کئی آیات کا مجموعی اقتضاء بیان کر رہا ہوتا ہے۔

پھر اس معاملے میں بات صرف لفظی ممانعت ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اگر یہ لفظی ممانعت ہمارے سامنے نہ بھی آئی ہوتی تو وہ پوری سوسائٹی جو کہ نبی صلعم نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر فرمائی تھی اپنے سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظام کے معمول کے ذریعے قرآن کی عملی تعبیر اسی طرح پیش کرتی ہے کہ ایک سلیم الطبع آدمی کا ذہن اس ممانعت تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اب جبکہ یہ لفظی ممانعت موجود ہے اور اس کی پشت پر نمونے کی ایک مسلم سوسائٹی کا تعامل اس کے حق میں ہے اور اس تعامل کے پیچھے پورا عقلی استدلال فراہم کرنے کے لیے قرآن کی آیات موجود ہیں تو کوئی احمق ہی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ آنحضورؐ کی اس ممانعت کے بارے میں یہ کہے کہ یہ کوئی سازشی روایت ہے یا یہ وقتی اجتہاد تھا، یا اس کی کوئی شرعی اہمیت نہیں ہے' یا یہ قرآن پر اضافہ ہے، یا یہ ہمارے لیے حجت نہیں ہے!

(۶) قرآن میں اسلامی ریاست کے امیرِ مملکت، اصحابِ شوریٰ اور دوسرے عہدہ داروں کے بارے میں اگر کوئی معیارِ انتخاب صراحتہً ملتا ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ―― اور یوں درحقیقت سب کچھ اس کے اندر مضمر ہے۔ لیکن اس رہنما اصول کے مضمرات میں سے ایک کو نبی صلعم یوں بے نقاب فرماتے ہیں:۔

نحن واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدًا طلبہ او حرص علیہ　　خدا کی قسم ہم اس ذمہ داری کے اوپر کسی ایسے شخص کو مامور نہیں کرتے جو اسکی تمنا کرے یا اس کی حرص رکھتا ہو۔

یہ روایت تنہا نہیں، متعدد دوسری روایات ہیں جو طلبِ منصب، امیدواری عہدہ اور خواہشِ جاہ کا سدِ باب کرتی ہیں۔ خالص قرآنی اسلام کا ایک علمبردار تو جھٹ سے اس پر یہ کہہ دیگا کہ یہ نعوذ باللہ قرآن پر اضافہ ہے، قرآن نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی۔ ہاں! آپ بلا شبہ قرآن سے اس طرح کی بات اخذ نہیں کر سکتے لیکن خدا کا رسول تو قرآن میں یہ پا لیتا ہے کہ خواہشِ منصب تقویٰ کے منافی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کن مقاصد کے لیے، کن اصولوں پر اور کن حدود کی پابندی میں اسلامی حکومت کو کام کرنا ہے، چنانچہ یہ مقاصد، یہ اصول اور یہ حدود من حیث المجموع یہ بات بول بول کے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے مطلب کی کوئی حکومت جاہ پسند لوگوں کے ذریعے نہیں چل سکتی، ہمارے تقاضے تو ایسے ہی لوگوں سے پورے ہو سکتے ہیں جو مناصب کی ذمہ داریوں کے بوجھ کا احساس رکھنے کی وجہ سے ان سے کوسوں دور بھاگتے ہوں، لیکن یہ بوجھ ان کے اوپر اس معاشرے کی طرف سے لاد دیا جائے۔ بخلاف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے اگر جاہ طلب لوگ آگے آجائیں جو حصولِ مناصب کے لیے باہم کشمکش کرنے والے، روپیہ لگانے والے اور جوڑ توڑ کرنے والے ہوں تو اُن مقاصد کا، ان اصولوں کا اور ان حدود کا خون ہو کے رہے گا جن پر اسلامی حکومت چلتی ہے۔ آج دنیا میں جمہوریت کو ناکامی تک پہنچانے کا ذریعہ جو اسباب بنے ہیں ان میں سے ایک نمایاں سبب امیدواری اور طلب مناصب کا فتنہ ہے۔ قرآن کا فلسفۂ سیاست اس کا متحمل نہیں، قرآن کے پیش کردہ نظام حکومت کے مزاج سے یہ سازگار نہیں، اسلامی معاشرے کی فطرت اس کے لیے سازگار نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا ادراک نبی اللہ کی دی ہوئی خاص حکیمانہ بصیرت سے کرتا ہے اور پھر وہ جاہ طلبی کی روک تھام کے لیے جو نہی کرتا ہے وہ اگرچہ اس کے اپنے الفاظ میں ہے لیکن عین منشائے قرآنی اس سے پورا ہوتا ہے۔

(۷) آپ کو معلوم ہے کہ مدینہ کے اسلامی معاشرہ کے سامنے ایک اہم سوال منافقین سے نمٹنے کا رہا ہے۔ عین ایمرجنسی کے حالات میں ایک عنصر غداری، تخریب اور سازش کی کارروائیوں میں لگا رہتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ نفاق ایک اہم موضوع بن جانا چاہیے تھا، چنانچہ قرآن مجید میں بےشمار مقامات پر منافقین اور ان کے نفاق پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ خود نبی صلعم کی مجلس میں بھی اس موضوع پر گفتگوئیں ہونی ہی چاہیے تھیں اور اب احادیث میں بھی اس موضوع پر سرمایۂ روایات کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ اسی سرمایۂ روایات میں ایک چیز یہ بھی پائی جاتی ہے:-

اربعٌ من کن فیہ کان منافقا خالصًا ومن کانَ فیہ خصلۃٌ منھنّ کان فیہ خصلۃ من النفاق حتی یَدَعَھَا إذَا اؤتُمِنَ خَانَ واذا حدث کذب واذا عاھد غدر، واذا خاصم فجر (الحدیث)

چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک موجود ہو تو گویا اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے تاوقتیکہ وہ اس سے باز نہ آجائے:- ایک یہ کہ جب بھی اس پر بھروسہ کیا جائے وہ خیانت دکھائے، دوسرے یہ کہ جب بھی بات کرے جھوٹ بولے، تیسرے یہ کہ جب بھی وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، چوتھے یہ کہ جب بھی جھگڑے تو فجور پر اتر آئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن نے منافق کے کردار کو کسی مقام پر اس شکل میں نمایاں نہیں کیا ہے لیکن قرآن نے منافقین کا ذہنی تجزیہ جس جس طرح کیا ہے، اُس پورے کو اگر اس روایت کے سامنے رکھا جائے تو وہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ خالص منافق عقائد کے لحاظ سے جس مقام پر ہوتا ہے اس سے ٹھیک وہی خصائل پیدا ہونے چاہئیں جن کو یہ روایت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ خصائل جہاں بھی پائے جائیں گے حقیقت ایمان کا فقدان خود بخود مفہوم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت تک آج ہم اس سہولت کے ساتھ اگر پہنچ سکتے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ اللہ کے رسول نے اپنی حکمتِ بالغہ کے ذریعے اس پر سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ یہ نبی کی حکمت تھی جس نے چند ظاہری خصائل کے پیچھے کام کرنے والی نفسیاتی اور قلبی حالت کو مبرہن کر دیا۔ اب یہ حقیقت ایک دینی حقیقت ہو گئی، اب آپ اسے وقتی رائے کہہ کر بدل نہیں سکتے۔ یہ توضیحِ حقیقت اللہ کے رسول نے معلّمِ حکمت ہونے کی حیثیت سے فرمائی ہے۔

ایسی بے شمار احادیث ہیں سے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم حکمت کے منصب سے کلام کرتے ہیں، یہ چند مثالیں جو ہم نے پیش کی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ آنحضورؐ کی حکمت قرآن سے الگ اور قرآن پر اضافہ کرنے والی نہیں بلکہ قرآن کے ہی منشا کو واضح تر کرنے والی اور اس کے باریک تقاضوں کو نمایاں اور اس کے بین السطور کو مجلّیٰ کرنے والی ہے۔ آنحضورؐ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر نہیں فرماتے بلکہ معلّمِ حکمت ہونے کی حیثیت سے ٹھیک وہی کچھ فرماتے ہیں جو قرآن کا اپنا ہی مقتضیٰ ہوتا ہے۔ یہ منصب کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، کہ وہ زمانے کے حالات کے بدل جانے کی بنیاد پر اس منصب سے خدا کے رسول کو ہٹانے اور خود آپ کی جگہ لینے یا کسی دوسرے کو یہ جگہ دلانے کا مدعی بنے۔ (باقی)

اسلامی نظامِ تعلیم اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر

مولانا مودودی کی وہ معرکتہ الآرا تقریر جو انہوں نے جمعیت طلباء کے ایک اجتماع میں فرمائی۔

قیمت ۵/   ملنے کا پتہ   مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

© rasailojaraid.com